ڈاکٹر اسرار کی یاد میں گفتگو

احمد جاوید صاحب

urdukutabkhanapk.blogspot



ڈاکٹر صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی یاد میں ایک گفتگو

''اسلام کی نشأۃِ ثانیہ: کرنے کا اصل کام''

پر جناب احمد جاوید کا اظہارِ خیال

علم نفسیات کی نظری اور عملی تشکیل سے بہت پہلے' مسلمانوں کے اندر ان کے دین سے وابستگی کے مزاج نے شخصیت کے بارے میں ایک ایسا تصور مسلّمات کے درجے میں لا کر رائج کر دیا تھا' جس کا ابتدائی خاکہ بنانے ہی میں نفسیات کی روایت کے کئی ادوار گزر گئے' اور اس علم کے کئی دبستان نارسائی کے غبار میں گم ہو گئے۔ انسانی شخصیت نظریات سے تشکیل نہیں پاتی' بلکہ اس کی تعمیر میں سب سے زیادہ ہاتھ ارادے اور میلانات کا ہوتا ہے۔ ارادہ شعور کے مستقل احوال کو نتیجہ خیز اعمال میں ڈھالنے کا کام کرتا ہے اور آدمی کے قلبی اور طبعی میلانات' جو ارادے کی دسترس سے باہر ہوتے ہیں' شعور میں رائج تصوّرات کے ساتھ تعلق کو ایک ایسی ساخت مہیا کرتے ہیں جو نہ صرف ذہنی ہے اور نہ فقط ارادی' بلکہ نفس کے زیادہ گہرے محرکات سے بنتی ہے۔ ان محرکات کو اگر فطرت کے نظامِ اقتضاء کے بنیادی عناصر قرار دیا جائے تو شاید غلط نہ ہوگا۔ اسلام نے طولِ تاریخ میں کمالِ انسانی کے جو لاتعداد شخصی مظاہر پیدا کیے ہیں ان میں' تنوع کی کارفرمائی کے باوجود' یہ وحدت اور اشتراک بہرحال نظر آتا ہے کہ تمام دین دار آدمیوں کی شخصیتیں ارادے اور طبیعت کی مستقل اَقدار پر استوار ہوتی ہیں۔ شخصیتوں کے مابین تنوع کی اساس بڑی حد تک ذہنی ہوتی ہے' مگر وجود کی ایمانی ماہیت میں طبیعت اور ارادے کی اندرونی کارفرمائی ہو یا ان کا عملی اظہار' دونوں سطحوں پر ایک ہمہ گیر وحدت برسرِ کار دکھائی دیتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے یہاں شخصیت کے دینی قوام میں ذہن کی حیثیت ثانوی ہے' فضائل و کمال کے اکثر معیارات طبعی اور عملی ہیں۔ لیکن چونکہ ذہن شخصیت میں وسعت پیدا کرنے کا سب سے بڑا ذریعہ ہے لہٰذا جن حضرات میں یہ طبیعت اور ارادے کے ساتھ ہم قدم بلکہ ہم حال ہو جاتا ہے وہ لوگ امت کے بہترین افراد ہوا کرتے ہیں۔ انہی کو تکمیل شخصیت کی وہ قوت میسّر آتی ہے جہاں ذہن حقائق سے اتنا مانوس ہو جاتا ہے کہ علم اور حال' اور تصور اور عمل میں کوئی فرق نہیں رہ جاتا۔ ذہن' ارادے اور طبیعت کی ایسی رو بہ کمال یکجائی ان تینوں کا سب سے قیمتی حاصل بھی ہے اور مقصود بھی۔ میں نے اللہ کے فضل سے اس درجۂ کمال پر پہنچی ہوئی کچھ شخصیتیں دیکھی ہیں' ان میں سے ہر ایک ایسا صاحب حضور تھا کہ اسے دیکھتے ہی یہ احساس ہو جاتا تھا کہ انسان کی پوری شخصیت ایک ہی سرچشمے سے کیسے سیراب ہوتی ہے۔ ان کا خیال ہو یا عمل' جذبات ہوں یا احساسات' سب کے سب ایک ہی قوت سے نمو پاتے تھے۔ ڈاکٹر اسرار احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ ان ہی شخصیات میں سے ایک تھے۔

مجھے ڈاکٹر صاحب سے زیادہ قرب تو نصیب نہیں رہا' چند ہی ملاقاتیں رہیں' لیکن ان کے اندر ایک وفورِ وجود تھا' جس کا پہلا مشاہدہ یا تجربہ ہی اتنا مکمل ہوتا تھا کہ بار بار ملنے سے بھی اس پر کوئی اضافہ ممکن نہیں لگتا تھا۔ میں نے اپنے استاد اور محسن مولانا محمد ایوب صاحب دہلویؒ کے بعد ڈاکٹر صاحب کو دیکھا کہ ان سے مل کر تمام جہاتِ تعلق روشن ہو جاتی تھیں۔ آدمی ایک نظامِ تعلقات کا حصہ ہے' اس کے لیے ہر تعلق کچھ مخصوص تاثرات کا حامل ہوتا ہے۔ مثلاً دوستی' رشتہ داری' خوردی و بزرگی' یا پھر انتہائی حد پر جا کر دیکھیے تو تعلق کی روحانی اقلیمیں' مثلاً اللہ سے تعلق' اللہ کے رسول ﷺ کے ساتھ تعلق' اللہ کی کتاب کے ساتھ تعلق' دین سے تعلق وغیرہ۔ ان میں سے ہر علاقہ اور ہر نسبت ایک خاص کیفیت رکھتی ہے' جو ذہن میں الگ الگ تصورات تشکیل دیتی ہے' عمل کو مخصوص محرکات فراہم کرتی ہے اور طبیعت میں خاص خاص جذبات و احساسات پیدا کرتی ہے۔ اسی لیے ہر تعلق اپنے حال میں منفرد ہوتا ہے۔ ایک مکمل شخصیت کی یہ پہچان بھی ہے کہ اس کے تعلق سے رونما ہونے والے احوال دیگر تعلقات کے ساتھ خاص کیفیات کا بھی احاطہ کر لیتے ہیں۔ میں جب بھی ڈاکٹر صاحب سے ملا مجھے ہمیشہ یہی محسوس ہوا کہ انہیں دیکھ کر باطن میں ایک رَو سی چلنے لگتی ہے' جو میرے تمام مراکزِ تعلق میں زندگی اور حرارت کی شدت بڑھا دیتی ہے۔ ان سے ملنا اپنی استعدادِ تعلق کو مکمل کرنے کا سامان رکھتا تھا۔ وہ ایسے آدمی تھے کہ ان کے طبعی داعیات بھی ایمانی تصورات سے مغائرت نہیں رکھتے تھے۔ اللہ کرے کہ ڈاکٹر صاحب کے متبعین اور متوسلین میں ان کی شخصیت کا یہ جوہر بھی ان کے افکار و خیالات کی طرح منتقل ہوا ہو۔ میری نگاہ میں ان کا یہ وصف ان کے تمام علمی و عملی محاسن پر فیصلہ کن فوقیت رکھتا ہے۔ وہ بلندیوں کا ایک سلسلہ تھے' جس میں یہ بلندی سب سے نمایاں ہے۔ کم از کم میرا تجربہ تو یہی ہے کہ میں نے جب بھی ڈاکٹر صاحب کو دیکھا تو یوں محسوس ہوا کہ اللہ کے حضور میں ہونے کے ایک وفور نے انہیں اپنے احاطے میں لے رکھا ہے۔ اور یہ حال کسی مشق یا ریاضت کا نتیجہ نہیں لگتا تھا' بلکہ اس کی بنیاد ایک ایسی چیز پر تھی جو تعلق باللہ کے مخصوص تصورات رکھ کر بعض متعین راستوں پر محنت و مشقت کے ساتھ چلنے والوں کی رسائی میں نہیں آسکتی۔ یہ چیز تھی فطرت کی ایسی بیداری' جو شخصیت کے تمام عناصر میں نہ صرف یہ کہ سرایت کر جاتی ہے' بلکہ بندے کو موجود ہونے کی رفیع ترین حالتوں سے بالکل طبعی انداز میں مانوس کر دیتی ہے۔ ایسے لوگ خیال سے احساس تک پائے جانے والے تقریباً اٹل فاصلے کو ختم کر دینے کی قدرت بہم پہنچا لیتے ہیں۔

ڈاکٹر صاحب کے لیے ان کے تمام تصورات ایک خوابناک سی کشش رکھتے تھے' بلکہ اتنے ہی یقینی تھے جتنے ہمارے لیے ہمارے محسوسات ہیں۔ ان سے واجبی علاقہ رکھنے والے حضرات بھی ان کے بارے میں کم از کم اتنا ضرور جان لیتے تھے کہ ان کے روزمرہ احساسات اور طبعی جذبات کا محرک عین وہی امر ہے جس نے ان کے ذہن کو منتہائے یقین تک پہنچے ہوئے تصوّرات ودیعت کیے تھے۔ وہ بلاشبہ ان خاص الخاص لوگوں میں سے تھے جو حق کے ساتھ مکمل ترین تنہائی کے متحمل ہو سکتے تھے' یعنی انہیں اللہ کے ساتھ اپنا تعلق ایسا عزیز تھا کہ وہ ساری دنیا سے پوری جمعیتِ خاطر اور اطمینانِ ذہنی کے ساتھ منقطع ہو سکتے تھے۔ مجھے تو یوں لگتا ہے جیسے انہوں نے خود کو

اپنے تصور سے بھی خالی کر رکھا تھا۔ اپنے تصور سے باہر ہو جانا ہی وہ مرتبۂ اخلاص ہے جس کے حصول کی تمنا اللہ کے دوستوں کی متاعِ وجود ہوتی ہے۔

حق کا وہ وجودی استحضار جو ڈاکٹر صاحب کی شخصیت کا قوام تھا' ان کی فکر بھی اسی سے وجود میں آئی ہے۔ ان کا ہر تصور ایک دائرے کی طرح ہے جو حق سے شروع ہو کر حق ہی پر تمام ہوتا ہے۔ وہ بھی اقبال' ابوالکلام آزاد' مولانا مودودی وغیرہ کی طرح قرآن کو زندہ کتاب کہتے تھے' مگر اس کتاب کا زندہ ہونا ان کے ہاں بعض ایسے مظاہر رکھتا ہے جو دیگر جلیل القدر لوگوں کی فکر میں نہیں آپائے تھے۔ مثال کے طور پر اقبال قرآن کی قوتِ حیات کو انسانی خودی کے پیکر کی تکمیل میں صرف کر دیتے ہیں' ابوالکلام اس کی حیات آفرینی کو مُردہ ذہنوں کی مسیحائی کے لیے استعمال کرتے ہیں' مولانا مودودی کتابِ الٰہی کی حیات بخشی کو ایک آفاقی سکیل میں کارفرما دیکھتے اور دکھاتے ہیں —— ان تینوں جہتوں سے کوئی اصولی اختلاف کیے بغیر ڈاکٹر صاحب نے قرآن کی تاثیرِ حیات کو وجود کی روحانی سے لے کر حیاتیاتی اقلیموں تک جس پھیلاؤ اور گہرائی کے ساتھ کارفرما دکھایا ہے وہ ان کے قریبی زمانے میں یقیناً ایک نئی چیز تھی۔ اس کے نتیجے میں قرآن ایک ایسے وجودی انقلاب کا جوہر واحد بن گیا جو آدمی کو مراتبِ کمال تک پہنچاتا ہے' کائنات کی تعبیرِ نو کرتا ہے' عقل کو قبولِ ہدایت کا مادہ بخشتا ہے' اور اتنا ہی نہیں' اس سے بہت آگے بڑھ کر تقدیر اور تاریخ کو انسان کے توسط سے یک جان کر دکھاتا ہے۔

اس نادر اصول کو علمی اور عملی سطحوں پر نتیجہ خیز قوت کے ساتھ منطبق کر دکھانا ڈاکٹر صاحب کی فکر کا وہ امتیاز ہے جسے سمجھنا بہت ضروری ہے۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہنا بھی غلط نہ ہوگا کہ ان کے قابلِ فخر پیش رووں اور معاصرین نے قرآن کو کتابِ حیات کہا اور ڈاکٹر صاحب نے اس میں توسیع کر کے اس صحیفۂ انقلاب کو کتابِ وجود سے تعبیر کیا' اور جا بجا مختلف پہلوؤں سے اس نکتے کو اظہار کے متنوع مراحل سے گزارا کہ وجود کی اصل' اس میں کارفرما نظامِ حرکت اور اس کی صورتوں کو تشکیل دینے والا قانونِ قدرت' سب کا سب قرآن سے پھوٹتا ہے اور اسی کی طرف رجوع کرتا ہے۔ یہ ہے وہ مقام جہاں فطرت اور ہدایت ایک ہو جاتی ہے اور اس وحدت کا تجربہ ہی حق کا حضور ہے۔ اب یہی دیکھیے کہ قرآن اور سائنس کے موضوع پر مسلمان علماء نے جو تھوڑا بہت کام کیا ہے اس کا مقصود یہی معلوم ہوتا ہے کہ سائنس دانوں کو خوشامد درآمد کے ذریعے قرآن پر معترضانہ نظر ڈالنے سے روکا جائے۔ ڈاکٹر صاحب نے بھی اس مضمون کو خاصی اہمیت دی ہے' لیکن کسی ایک جگہ پر بھی انہوں نے ایسی مداہنانہ روش اختیار نہیں کی' بلکہ اس میدان میں ان کی تمام کاوشوں کا خلاصہ یہ ہے کہ فطرت کی طرف یکسوئی کے نتیجے میں امرِ ہدایت میں مخفی حقائق تک اتفاقی رسائی ہو جاتی ہے' جسے بامعنی بنانے کا کام سائنس والے نہیں بلکہ وہ لوگ کریں گے جو قرآن کے علوم میں رسوخ رکھتے ہیں۔ قرآن کا عطا کردہ ذوقِ حقائق اتنا قوی ہے کہ صورتوں کا causal structure اس سے مستغنی ہو کر قائم نہیں رہ سکتا۔ میں نہیں سمجھتا کہ علمِ ہدایت اور علمِ فطرت کی وحدتِ اصلی کی طرف اشارہ کرنے والا کوئی ایسا تناظر قائم کیا جا سکتا ہے جو اس سے بہتر ہو۔

یوں تو ڈاکٹر صاحب کی ہر تحریر ان کے نظامِ فکر کی تشکیل میں ایک انفرادی اور ناگزیر حیثیت رکھتی ہے' تاہم ''اسلام کی نشأۃِ ثانیہ'' نامی رسالہ ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کی فکر میں بیج کی حیثیت رکھتا ہے۔ انیسویں صدی میں

مغرب کے ہمہ گیر غلبے کی وجہ سے مسلم ذہن میں چند رجحانات پیدا ہوئے۔ ان رجحانات کی ساخت ایک پہلو سے علمی تھی تو دوسری جہت سے عملی۔ اس غلبے نے ہماری نفسیات' ذہنیت اور ہماری تہذیب پر بالکل اسی طرح کے اثرات مترتب کیے جیسی تاثیر کسی ہمہ گیر نظریے یا ہماری اصطلاح میں دین میں ہوتی ہے۔ یعنی مغرب کا غلبہ انسان کو اس کی تمام سطحوں پر موجود ہونے کے ایک نئے اسلوب کی طرف دھکیل رہا تھا۔ اس کے سامنے ہستی کے گزشتہ تمام اصول' خواہ دینی ہوں یا دنیاوی' انہیں چھوڑنا لازم اور ناگزیر تھا۔ اس غلبے کے آگے مسلمانوں کی دفاعی جِدّ وجُہد کے نتیجے میں ایک ایسا ذہن اور مزاج سامنے آیا جسے انقلابی کہنا شاید درست ہوگا۔ انیسویں صدی سے شروع ہو کر بیسویں صدی تک اپنے کمال تک پہنچنے والا یہ ذہنی' تہذیبی اور نفسیاتی رویہ دراصل اپنی بقا کے تمام امکانات کو مغرب سے پیدا ہونے والے اس جبری تعلق کی روشنی میں دیکھنے کا عادی ہو چکا تھا۔ بالفاظِ دیگر ہمارے دینی ذہن کی روایت میں ایک ایسے انقلابی مادے نے نمو پکڑنی شروع کر دی تھی جس کا خالق غالباً دین نہیں تھا بلکہ غلبۂ مغرب تھا۔ اس وجہ سے اس انقلابی فکر نے ہمارے دین کو کچھ نئی تعبیرات سے گزارنے اور کچھ نئی تعریفات کو قبول کروانے کا بیڑا اٹھایا' اس فکر میں شروع ہی سے ایک عدمِ توازن تھا' اور وہ یہ کہ اس میں اسلام کے اندر خود بخود پہلے سے پائی جانے والی انقلابی قوت کو غلط طور پر دیکھا گیا اور اسلام میں پیدا ہونے والی روحِ انقلاب کو محض ایک خارجی جسد میں محبوس کرنے کا قصد کیا گیا' جس کی وجہ سے دین کی بنیادی تعبیر یا دین کو قبول کرنے کے فطری زاویے میں خلل سا پڑتا محسوس ہوا' اور وہ یہ کہ ایک پہلو سے یہ دین محض ایک آرڈر بن کر رہ گیا اور دوسرے رخ سے یہ ایک ایسے آئیڈیلزم کے رنگ میں ڈھل گیا جو تمناؤں کو تسکین تو پہنچا سکتا تھا لیکن ان کی تکمیل کا سامان فراہم نہیں کر سکتا تھا۔ ایک مدت تک غلبۂ مغرب کے مقابل ہو کر پنپنے والی انقلابی تعبیرات اور تحریکی تصورات ان دونوں خانوں میں بٹے رہے۔ ایک یہ سمجھتا رہا کہ مغرب گویا ایک طاغوتی نظام ہے جس کو ہم اعلائے کلمۃ الحق کی جِدّ وجہد یا اعلائے کلمۃ الحق کو مرکز بنانے والے دوسرے نظام سے بدل سکتے ہیں یا دوسرے نظام سے شکست دے سکتے ہیں۔ دوسری طرف یہ اندازِ نظر تھا کہ مغرب کے غلبے کے آثار محض ایک نظام کے قیام کا تقاضا نہیں کرتے' بلکہ اس کے علاوہ اس چیز کے بھی متقاضی ہیں کہ ہم مغرب کے idealistic structure کو تھامنے کے لیے خود اپنے دین کو انہی بنیادوں پر کامیابی سے بروئے کار دکھائیں جن بنیادوں کو مغرب اپنے استعمال اور تصرف میں لایا تھا' بلکہ اس سے بڑھ کر جن بنیادوں کو مغرب نے خود پیدا کیا تھا۔ مغرب کے آئیڈیلز کو تھامنے والے ستونوں کی تعمیر اس دین میں بھی شروع ہوگئی۔ اس طرح کے انقلابی اور تحریکی ماحول میں یا ردِ مغرب کی مسلم روایت کا زیادہ تر حصہ انہی دو رویوں میں منقسم نظر آتا ہے۔

میری رائے میں اس روایت سے دو استثناء ہیں' ایک مولانا مودودیؒ دوسرے ڈاکٹر اسرار احمد صاحبؒ۔ مودودی صاحب کا کمال یہ ہے کہ انہوں نے انقلاب میں درکار ideals کو محض جذبات کی تحویل میں نہیں چھوڑا بلکہ اسے عمل میں ڈھالنے کا بھی رستہ نکالا۔ مولانا مودودی کی فکر کے بعض یا اکثر اجزاء پر اعتراض یا اشکال محسوس کرنے کے باوجود لگتا یہی ہے کہ اصولی طور پر ان کا موقفِ انقلاب درست تھا اور اس موقف پر دینی اطمینان اور اعتماد کے ساتھ کھڑے رہنے کی بہت زیادہ گنجائش تھی۔ ان کی فکر اپنی اصولی ساخت میں دین کو بدل دینے والی

تعبیر تک نہیں پہنچتی تھی۔ چونکہ ہم اس وقت ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کی ایک کتاب پر گفتگو کر رہے ہیں اس لیے مودودی صاحب کے اس خاص الخاص وصف کی تفصیل میں جانے سے بچ کر یہاں اس دروازے سے ڈاکٹر صاحب کی فکر کے ایک امتیازی جوہر تک پہنچنے کی کوشش کریں گے۔ اس پہلو سے ڈاکٹر صاحب اصلاً مولانا مودودی کی روایت ہی کے آدمی ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے مودودی صاحب کے اس اصول پر بہت بامعنی اضافہ کیا۔ وہ یہ ہے کہ ان کی عملیت پسندی مودودی صاحب کی طرح اجتماعی (communal) ہونے کے باوجود انسان کے خلقی ارادے کا موضوع بننے کی زیادہ قابلیت رکھتی ہے۔ اس بات کو یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ مودودی صاحب کے یہاں عمل کا ڈھانچہ اخلاقی و نظریاتی زیادہ ہے جس میں آدمی کی خلقی استعداد کو اہمیت نہیں دی گئی' جبکہ ڈاکٹر صاحب عمل کو اس کے اخلاقی جوہر پر استوار رکھتے ہوئے اپنے مخاطب کی صلاحیت عمل کو نہ صرف یہ کہ نظر انداز نہیں کرتے بلکہ اسے ایک بنیادی حیثیت دیتے ہیں۔ میرے خیال میں ان کی فکر ایک جدلیاتی ساخت اور قطعیتی تعامل رکھتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے خلقت کو اخلاق سے' عمل کو تصور سے' تاریخ کو تقدیر سے اور انفس کو آفاق سے ان کے بنیادی امتیازات سمیت بہت متحرک' بہت نتیجہ خیز انداز سے ہم آہنگ کر دکھایا ہے۔ یہ چیز کچھ اشاروں کی طرح بھی کہیں اور نہیں ملتی۔

ہم سب یہ جانتے ہیں کہ انقلاب کا قوام بننے والی فکر ہمیشہ جدلی ہوتی ہے اور اس میں آدرش اور عمل کے درمیان پائے جانے والے ناگزیر فاصلے کو جذبات کے وفور سے کم یا ختم نہیں کیا جاتا' بلکہ اس فاصلے کو ایک ایسا خلا بننے سے بچا لینا ہی کافی ہوتا ہے جہاں نہ مقصد کی قبولیت کا کوئی امکان ہو اور نہ اس مقصد کی اساس پر پیدا ہونے والے عمل کی پیدائش کا کوئی رستہ ہو۔ ڈاکٹر صاحب نے ideal اور actual کے امتیاز کو اپنی شدید ترین تمنائے انقلاب کے باوجود نہ صرف یہ کہ ملحوظ رکھا بلکہ ان کے درمیان کچھ ایسی نسبتیں دریافت کر کے دکھائیں جن کی کارفرمائی سے ان دونوں کا باہمی امتیاز تضاد یا تصادم کی صورت اختیار کرنے سے محفوظ رہے۔ ان کے ہاں یہ نادر بصیرت قدم قدم پر نظر آتی ہے کہ آئیڈیل میں ایک بہت بنیادی عنصر اس کے مآل عملی ہونے کا ہوتا ہے۔ انسان وجود اور شعور کی تمام تر قوت اور آمادگی کے باوجود ideal کی سو فیصد actualization پر اصرار نہیں کرتا۔ اصرار تو دور کی بات ہے وہ اس تصور کو بھی اجنبی گردانتا ہے جو آئیڈیلز کو exhaustably actualize کرنے کی امید دلاتے ہیں۔ انسان اور دنیا کی اس مستقل وجودی تحدید کے گہرے ادراک کی وجہ سے ڈاکٹر صاحب کے لیے یہ ممکن ہو گیا کہ انقلاب کے تصوّر اور انقلاب کی جدّ و جہد میں کثیر المراتب نسبتوں کو کس طرح محفوظ رکھا جائے کہ تصور میں کوئی کمی نہ کرنی پڑے اور عمل کو کسی نقطۂ اختتام سے دور رکھا جا سکے۔ یعنی آئیڈیل کا جوہر کمال ہے اور عمل کا انحصار صداقت پر ہے۔ ایک کو ہر حال میں کامل رہنا چاہیے اور دوسرے کو اپنی خلقی تحدیدات کی وجہ سے کمال تک پہنچنے کا ادّعا رکھنے کی بجائے صداقت کے جوہر سے ابھرنے والی یکسوئی کو برقرار رکھنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ ڈاکٹر صاحب اپنے آئیڈیلز کو ایک ہمہ گیر تصور کے طور پر تشکیل دینے میں کسی idealist سے پیچھے نہیں ہیں' اور اس کے ساتھ ساتھ انسان کے عملی وجود اور اس کی استعداد کی پوری رعایت

رکھتے ہوئے اسے کام میں لانے کی صورتیں نکالنے میں بھی ان جیسا مفکر مشکل سے ملے گا۔ یہ بات بعض اوقات حیرت میں ڈال دیتی ہے کہ وہ مثال کے طور پر' تاریخ اور تقدیر کو کتنی پختگی اور سہولت کے ساتھ ایک دوسرے کے ساتھ گندھا ہوا دیکھتے اور دکھاتے ہیں...... تاریخ جو عمل کا موضوع ہے اور تقدیر جو عقل کی پراپرٹی ہے! ان دونوں' عمل کا زمانی اور خیال کا لازمانی ہونا' ڈاکٹر صاحب کی فکر میں خمیر کی حیثیت رکھتا ہے۔

اس رسالے میں غالباً نشاۃ ثانیہ کے تصور کو مسلمانوں میں موجود تمام تعبیرات سے زیادہ محکم اور مکمل حالت میں بیان کیا گیا ہے۔ دینی ذہن کے لیے انقلاب' تجدید یعنی نشاۃ ثانیہ کا نام ہے' یعنی انسان اور اس کی دنیا میں پیدا ہو جانے والی تمام خرابیوں کو اس خاص وقت کے محاسن اور کمالات کو حاصل کر کے ہی بدلا جا سکتا ہے جس وقت میں دین کے بانی نے حق کو زندگی کی ہر باطنی اور ظاہری سطح پر خلق کے اوپر حتماً غالب کر کے دکھایا تھا۔ انسان' دنیا اور زمانے میں حق' خیر اور حسن کی جتنی بھی استعداد پائی جاتی ہے اسے بانیٔ دین یا امامِ ہدایت استعمال میں لا کر دکھا دیتا ہے۔ آگے چل کر جب انفس و آفاق میں سرایت کر جانے والے کمالات ضعیف پڑنے لگتے ہیں تو اس دین پر چلنے والے اپنی روحانی' ذہنی' اخلاقی' ارادی اور طبعی قوتوں کو مجتمع کر کے ان کمالات کے احیا کی طرف یکسو ہو جاتے ہیں۔ دینی انقلاب اپنی تمام تر تفصیلات کے ہر ہر جز میں اسی اصول پر کھڑا ہوا ہے۔ ہماری انقلابی فکر کی روایت میں اس اصول پر کسی کا اختلاف نہیں' فرق وہاں سے پڑتا ہے جہاں کچھ لوگ انفس کو آفاق پر ترجیح و تقدیم دیتے ہیں اور بعض افراد اس کے برعکس۔ انفس کے تقدم کی بنیاد پر آفاق کی تشکیلِ نو کا تصور اس روایت کے غالب حصے میں موجود نہیں پایا جاتا' حتیٰ کے مولانا مودودی کے ہاں بھی نہیں۔ غالباً پہلی مرتبہ ڈاکٹر صاحب نے اس نکتے کو بہت واضح طریقے سے اٹھایا ہے۔ اس سلسلے میں ان کا رسالہ ''اسلام کی نشاۃِ ثانیہ'' ایک بہت قیمتی دستاویز ہے۔ اپنی اس تحریر میں انہوں نے بہت محکم اور مفصل انداز سے یہ بتایا ہے کہ نشاۃِ ثانیہ کا کوئی تصور اس ''مثالی باطن'' کی بازیافت سے بے نیاز نہیں رہ سکتا جو رسول اللہ ﷺ نے انفس کے پورے پھیلاؤ کے ساتھ قائم کر کے دکھایا تھا۔ یہ پھیلاؤ ایسا ہے کہ آفاق اس کو محیط نہیں ہے بلکہ اس میں گوشہ گیر ہے۔

فکری افتاد کے اعتبار سے ڈاکٹر صاحب کے تمام تصورات ایک نظریہ انقلاب کے اجزاء کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان کا مادۂ فکر انقلاب ہے اور انہوں نے اس کے ذہنی مظاہر ہی پیدا نہیں کیے بلکہ اسے طبیعت اور ارادے کا مستقل ہدف بنا کر گویا زندگی اور انقلاب کو ہم معنی اور ہم احوال کر کے دکھا دیا۔ ڈاکٹر صاحب اس کلاسیکی روایت کے شاید آخری نمائندے ہیں جن کے ہاں اصول کی اجمالی ساخت کو اس ہمہ گیری کے ساتھ کھولا گیا ہے کہ یوں معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے اصول کو اس کے اجمال کی پوری نگہ داری کے ساتھ اس طرح بیان کر دیا ہے کہ جو اسے مجمل رکھتے ہوئے ذہنی اور ارادی یکسوئی کا واحد ہدف بنانے کے لائق کر دیتا ہے۔ یہ اس رسالے کا structure ہے۔

جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا کہ ڈاکٹر صاحب کا آئیڈیلزم ذہن کی تصور سازی کی عمدہ قوتوں سے تشکیل پانے کے باوجود عمل پذیری کے امکان بلکہ استعداد کو کسی پہلو سے اوجھل نہیں رہنے دیتا۔ اس رسالے کے ہر قاری کو بلا تکلف یہ محسوس ہوگا کہ ڈاکٹر صاحب کا مقصودِ فکر اپنے اجمال اور تفصیل دونوں میں عمل سے ایسی مناسبت رکھتا

ہے جو معمول کے اسلوبِ عمل سے مختلف تو ہے مگر اس کے لیے اجنبی نہیں۔ اس بات کو یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ انقلابی فکر کی روایت کا سب سے قیمتی جوہر یہی ہوتا ہے کہ تصور اپنے تمام تر اطلاق اور کلیت کے باوجود عمل کا محرک اور منتہا بننے کی صلاحیت حاصل کر لے۔ اس رسالے میں ڈاکٹر صاحب کا مرکزی تصور مصداق بننے کے اکثر تقاضے پورے کر دکھاتا ہے اور قدرے گہرائی میں جا کر تجزیہ کیا جائے تو یہ انکشاف بھی میسّر آ سکتا ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے ایک اعلیٰ درجے کی ٹھیٹھ فلسفیانہ سطح پر بھی تکنیکی ضوابط کی پابندی کیے بغیر انسانی شعور کے ایک بنیادی اقتضاء کو پورا کیا ہے۔ وہ اقتضاء ذہن' ارادے اور طبیعت کی یک اصلی اور یک ہدفی کا حصول ہے۔ مجھے اپنے طور پر تو ایسا ہی محسوس ہوتا ہے کہ ''اسلام کی نشأۃِ ثانیہ'' میں قوائے شعور اور قوائے ہستی میں کارفرما اس فعال وحدت کو دریافت کیا گیا ہے' جس کے بغیر انسان اور دین میں کوئی نتیجہ خیز نسبت فراہم نہیں ہو سکتی۔ اور یہی نہیں' خود انسان کی اندرونی تشکیل اور تاریخی تکمیل بھی اس وحدت تک پہنچے بغیر ممکن نہیں رہتی' کیونکہ ڈاکٹر صاحب انسان کے باطن کو حضورِ حق اور اس کے ظاہر کو امرِ حق کے جوہر پر استوار مانتے ہیں۔ اس لیے ان کے ہاں نفسِ انسان اور عالمِ انسان یا انسان کے اندرونی نظام اور اس کی خارجی دنیا کی اصل واحد ہے' اور ان دونوں کو ایک دوسرے سے غیر مربوط رکھنے کا نتیجہ ان کی نظر میں اس کے سوا کچھ نہ نکلے گا کہ آدمی کا باطن بھی مسخ ہو کر رہ جائے اور اس کی دنیا بھی انارکی کی لپیٹ میں آ جائے۔ ہمارا ایمانی وجود ہمارے تاریخی وجود سے منقطع اور لاتعلق ہو کر نہ اپنی تشکیل کر سکتا ہے اور نہ ہی اپنی بقا کے اسباب فراہم کر سکتا ہے۔

ڈاکٹر صاحب کی ندرتِ فکر یہ ہے کہ برصغیر کی حد تک انہوں نے پہلی مرتبہ انسانیت کے باطنی اصول یعنی ایمان کو اس کے تاریخی اصول پر حتماً غالب کر کے دکھایا' اور اس غلبے کو جن دلائل پر استوار کیا وہ دلائل ٹھیٹھ مذہبی یا کلامی نہیں بلکہ تاریخی ہیں۔ یہ ایک بہت مشکل مرحلہ ہوتا ہے کہ ایک چیز کو دوسری پر اصولاً غالب رکھتے ہوئے اس پر منحصر بھی کیا جائے۔ میرے خیال میں ڈاکٹر صاحب کی تمام فکر کا یہ خاصہ ہے کہ وہ اس توازن کے دہرے پن کو گرفت میں لے آتی ہے جسے ملحوظ نہ رکھنے سے انقلاب کے بعض مراحل تسلیم سے اور ارادے کے اکثر مراتبِ تعمیل سے خارج رہ جاتے ہیں۔ اس بات کو شاید ابھی تجزیے کی ضرورت ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے خواب اور تعبیر کے تقدیری توازن کو کس کس زاویے سے برقرار رکھا' اور صرف برقرار ہی نہیں رکھا' بلکہ ان کے درمیان ایک دوسرے کو متاثر کرنے والے اصول تک بھی رسائی حاصل کی۔ ایک خاص ذوق کے دائرے میں رہتے ہوئے بات کی جائے تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ ڈاکٹر صاحب نے تعلق مع الحق کو انسان کی پوری وجودی استعداد کے ساتھ بیان کرنے کی ایک حیرت انگیز حد تک کامیاب کاوش کی ہے۔ اس کاوش کے mechanics اگر سمجھ لیے جائیں تو دین' آدمی اور دنیا اپنی مشترک اصل اور اپنی فطری نسبتوں پر پھر سے قائم کیے جا سکتے ہیں۔ یہی نشأۃِ ثانیہ کا وہ تصور ہے جس کا ادراک و اظہار ڈاکٹر صاحب کے حصے میں آیا۔

اوپر جو ہم نے اصول کے اجمال و تفصیل کی بات کی تھی اس کا ایک مطلب یہ بھی ہے کہ اجمال اصول کی طرف یکسو رہنے کی راہ فراہم کرتا ہے اور تفصیل کسی چیز کو اصول کے دائرے سے باہر نہیں ہونے دیتی۔ اس استحضار' یکسوئی اور احاطے کو ڈاکٹر صاحب نے ایسے زاویوں سے ہم آہنگ اور محفوظ کر رکھا ہے کہ انسان اور

کائنات کے بارے میں ایسی بصیرت میسّر آ جاتی ہے جو ان دونوں کی تحقیق کا ذمہ لینے والے مستند اور معیاری علوم کے لیے بھی قابلِ قبول ہیں۔ متداول مذہبی ذہن عموماً انسان اور کائنات کا ایک اجنبی یا متروک یا بے تاثیر تصور رکھتا ہے جس کی تعمیر میں ذہن کی جن قوتوں نے حصہ لیا تھا وہ خاصی پسماندہ ہیں' اور خود ذہن کب کا ان سے دستبردار ہو چکا ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے موجودہ مذہبی ذہن کو اس کمزوری سے نکالا ہے اور انہوں نے دین کو بنیادی مادہ بنا کر انسان اور دنیا کی وہ تعبیرات تشکیل دی ہیں جو کسی بھی مستند علم کی روایت میں کم از کم ایک وقعت ضرور رکھتی ہیں۔

انقلابی فکر میں جس اصول اور نصب العین کو عمل میں لانے کی ضرورت ہوتی ہے ڈاکٹر صاحب اس اساس اور ہدف کو انسان کی استعدادِ عمل اور تاریخ کے مزاجِ تغیر کی جیسی گہری رعایت رکھتے ہوئے جامۂ عمل پہنانے کا راستہ کھولتے ہیں وہ انقلابی فکر کی روایت میں خاصے کی چیز ہے۔ مثال کے طور پر ان کے مشہور رسالے ''اسلام کی نشاۃ ثانیہ'' میں اصول کو عمل میں لانے کی کم سے کم تغیر پذیر تدبیریں بتائی گئی ہیں۔ سب جانتے ہیں کہ عملِ نظام کو تغیر سے دور رکھنا ایک مشکل کام ہے' جو ڈاکٹر صاحب کی تمام تحریکی اور انقلابی تحریروں میں بہت خوبی سے کیا گیا ہے۔ نظریے کے مراحلِ تعمیل کو شعور کے معمولی تغیرات اور وقت کی روزمرہ تبدیلیوں کی زد سے بیش از بیش باہر رکھنا کسی بھی ورلڈ ویو کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔ ہمارے یہاں کے متجدّدین کم از کم اس بات کو بالکل نہیں سمجھتے کہ ذہن اور خارج میں سر اٹھانے والی ہر تبدیلی اتنی اہم اور بامعنی نہیں ہوتی کہ اسے اصول کی actualization میں دخیل کر لیا جائے۔ انسان اور اس کی دنیا میں حرکت کا فطری اصول زیادہ تر خواہش پر مبنی اور تقریباً جبلی ہوتا ہے۔ اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والے تغیرات کو قابو میں رکھنا ضروری ہے نہ کہ اسے مصنوعی اہمیت دے کر اصول میں ملاوٹ کا ذریعہ بنا لینا۔ ڈاکٹر صاحب تاریخ اور انسان کے بارے میں ایک نادر بصیرت رکھتے ہیں اور اس لیے بخوبی جانتے ہیں کہ انسان کے نفسی محرکات اور تاریخ کی سطحی واقعیت اس لائق نہیں ہوتی کہ وہ مستقل نظریے کو عملی مظاہر فراہم کر سکے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ حرکت کے جبری' حیاتیاتی بلکہ جبلی نظام کے لیے پوری نظریاتی قوت کے ساتھ انکار کا رویہ اختیار کیا جائے تاکہ تبدیلی کا ناگزیر اور ہمہ گیر عمل بالکل ہی بے اثر ہو کر نہ رہ جائے۔ ڈاکٹر صاحب اسی لیے تبدیلی کو پیدا کرنے کی دعوت دیتے ہیں' اسے واقع ہونے کی اجازت نہیں دیتے۔ ٹھیٹھ علمی اصطلاح میں کہا جائے تو ان کا مدارِ فکر یہ ہے کہ دین پر قائم اور حق سے نمو پانے والا شعور زندگی کے تمام تر نظامِ حرکت وسکون پر غالب آ کر دکھائے۔ ان کی نظر میں انقلاب کا اصل ہدف بھی ہے اور اسی مادے سے زندگی کے بہاؤ کو ایک انسانی حرکت اور انسانی سمت میسر آتی ہے۔ ان کے ہاں نفس پر غلبے کو تاریخ کا فاتح بننے کے لیے ضروری اسی لیے قرار دیا گیا ہے کہ زندگی کی معنی آفرینی کا عمل لازم ہے کہ انسان کے اندر تشکیل پائے اور پھر زندگی کی کائناتِ صورت میں ایک اصول کی طرح سرایت کر جائے۔

بدقسمتی سے ہمارے مذہبی ذہن میں بھی انقلاب کا تصور قوت وطاقت کے ساتھ اس قدر وابستہ ہو چکا ہے کہ انسان کی باطنی تکمیل کا تخیل سرے سے نظر انداز ہو گیا ہے۔ انسان کا خود پر غلبہ ڈاکٹر صاحب کے تصورِ

انقلاب کی بنیاد بھی ہے اور منتہا بھی۔ یہ غلبہ تزکیے کے روایتی، روحانی و اخلاقی معنی میں نہیں ہے، بلکہ یہ ایک طرح سے انسان کی پوری تعمیرِ نو کا عمل ہے جس کے ذریعے سے آدمی حیاتیاتی سطح سے وجودی مرتبے تک پہنچنے کا سفر طے کرتا ہے۔ اس کا بڑا فائدہ یہ ہے کہ اس میں کسی بھی طرح کی داخلیت پسندی نہیں پیدا ہوتی، بلکہ انسان خود سے وہ ضروری فاصلہ پیدا کرنے پر قادر ہو جاتا ہے کہ جس کے بغیر ذات کی تعمیرِ نو نہیں ہو سکتی۔

ایک داعیٔ اسلام کو آج کی دنیا میں کسی بڑے کام کا منصوبہ بناتے وقت مغرب کو جتنی اہمیت دینی چاہیے وہ ہمارے تحریکی اور انقلابی لٹریچر میں نظر نہیں آتی۔ ڈاکٹر صاحب نے اس کمی کو پورا کیا ہے۔ یہ بات دورِ جدید کے بدیہیات میں سے ہے کہ آج انسان و کائنات اپنے ہر ہر جزو میں مغرب کی دی ہوئی تعریف پر قائم نہیں بلکہ موجود ہیں۔ تاریخِ انسانی میں یہ پہلی بار ہوا ہے کہ کوئی ایک نظریہ اور طرزِ حیات انفس و آفاق کو اس طرح محیط ہو جائے کہ اس کے باہر ذہن کے لیے بھی بس خلا ہی خلا ہو اور زندگی کے باہر بھی بس عدم ہی عدم ہو۔ مغرب کے اس ہمہ جہتی تسلّط سے آنکھ بند کر لینا ایک سادہ لوحی تو ہے ہی، دینی طور پر بھی مضر ہے۔ ہماری متداول مذہبی فکر نے مغرب کا جو تصوّر باندھ رکھا ہے اور اس بنیاد پر اس کے لیے جو رویہ اختیار کیا ہوا ہے وہ سرے سے مضحکہ خیز ہے۔ ہمارے موجودہ زوال کا غالباً سب سے زیادہ ثابت شدہ سبب یہی ہے کہ ہم نے مغرب کو ایک دینی اور روحانی بصیرت کے ساتھ سمجھنے اور پھر عمل و تدبیر کی برترین سطح پر پہنچ کر اس کی مقاومت کرنے میں مسلسل نااہلی کا مظاہرہ کیا ہے۔ ہمارے مذہبی طبقات اس پر جس طفلانہ خود اعتمادی کے ساتھ یلغار کرنے پر تلے رہتے ہیں۔ اس سے مغرب کا تو کچھ نہیں بگڑ سکتا ہمارا ہی دینی نقصان ہو رہا ہے۔ یہ بالکل سامنے کی بات ہے کہ مغرب انسانی کمالات اور دُنیوی ترقی کا واحد ماڈل بن چکا ہے۔ اس نے انسانیت کے جو اصول اور تاریخ کے جو قوانین مقرر کر دیے ہیں وہ گویا آئینِ فطرت کی طرف ساری دنیا پر نافذ ہو چکے ہیں۔ اس غلبے کو جذباتی نعروں، غضب ناک بڑھکوں اور احمقانہ خوش فہمیوں سے نہیں توڑا جا سکتا۔ سرِ دست ہم ایک دیو پر بونوں کی طرح یلغار کر رہے ہیں اور اس کا جو نتیجہ نکلنا تھا اسے مسلسل بھگتتے چلے جا رہے ہیں۔

ڈاکٹر صاحب نے غالباً پہلی مرتبہ مغرب کی قوت کے واقعی اسباب کا ادراک کیا اور پھر اس کی طاغوتی روح سے نبرد آزما ہونے کے لیے کچھ ایسے وسائل ڈھونڈنے کی کوشش کی جو ذہنی، اخلاقی اور عملی سطح پر آج کل کی طرح کی پسماندگی کے مظاہر نہ ہوں۔ مغرب نے تسخیرِ کائنات کے مقصود کو جس یکسوئی اور کامیابی کے ساتھ ممکن الحصول باور کروایا ہے ڈاکٹر صاحب اس سے کوئی ٹکراؤ نہیں پیدا کرنا چاہتے بلکہ اس تسخیری قوت کو اپنے کام میں لانا چاہتے ہیں۔ ان کا اصل نکتہ یہ ہے کہ تسخیرِ عالم کی طرف ایک غیر متوازن یکسوئی نے مغرب کو جس دنیا پرستی میں دھکیل دیا ہے اس سے صرف تسخیرِ آدم کے ذریعے سے نکلا جا سکتا ہے۔ وہی تسخیرِ آدم جو اس دنیا میں اسلام کا اصل مقصود ہے۔ آدم سازی کی اقدار اگر عالمگیری کے عمل پر رہنمایانہ انداز میں غالب آ جائیں تو یہاں انقلاب کا پورا آئیڈیل گویا بہ تمام ہی عمل میں آ جاتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کائنات کے mechanics اور دنیا میں افادہ رسانی کی استعداد کو استعمال کرنے کے معاملے میں مغرب سے پنجہ کشی کو بے سود سمجھتے ہیں اور اپنی ساری توجہ اس عمل پر

مرتکز رکھتے ہیں کہ انسانی شعور میں وہ انقلاب کیسے برپا کیا جائے جو مغرب کی کائناتِ صورت کو ایمانی معنی فراہم کردے۔ مغرب نے جس طرح انفس کو خلا بنا کر آفاق کو معمور کر رکھا ہے ڈاکٹر صاحب کی مبارزت اسی الیے سے ہے۔ وہ کائنات کی مغرب کی طرف سے کی گئی معموری کو تقریباً قبول کرتے ہوئے اسے انفس کی تعمیر میں ایک جزو بنانا چاہتے ہیں۔ یہ وہ رویہ ہے کہ جس کی ہمیں بہت زیادہ ضرورت تھی مگر ہماری مذہبی فکر کے تابع جذبات ہو جانے کی وجہ سے کبھی پوری نہ ہو سکی۔ آخر اس چیز کے کوئی معنی تو ہوں گے کہ ڈاکٹر صاحب نظریہ ارتقاء اور بگ بینگ تھیوری وغیرہ پر بہت زیادہ ناقدانہ نظر نہیں رکھتے، لیکن مغرب کے سماجی اور نفسیاتی اصول کو الف سے یے تک رد کرنے پر کمر بستہ رہتے ہیں۔ وہ کائنات کے طبیعی اور مادی تجزیے میں مغرب کی تحقیقات کو ہمارے ایمانی تناظر سے متصادم نہیں دیکھتے، لیکن مغرب کے تصورِ انسان کو اپنے دین کے لیے سب سے بڑا خطرہ جانتے ہیں۔ یہی وہ درست پوزیشن ہے جہاں سے ہم کامیابی کی غالب امید کے ساتھ مغرب پر حملہ آور ہو سکتے ہیں۔

مختصر یہ کہ خالص universtality اور منتشر particularity دونوں ہی گویا ناکام ہونے کے لیے جنم لیتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے ان دونوں کو synthesize کیا ہے اور ان کے امتیازات کا لحاظ رکھتے ہوئے ان کی وحدت کو ایک ورلڈ ویو کی تشکیل میں صرف کیا ہے۔ یہ ورلڈ ویو تقدیری بھی ہے اور تاریخی بھی، سیاسی بھی ہے اور روحانی بھی، اور مستقل بھی ہے اور متغیر بھی۔

اس کتاب میں ایک خاص تصورِ انقلاب بھی ملتا ہے جسے کھولنے کی ضرورت ہے۔ ایک مسلمان کے لیے اس کے دین کی نشاۃِ ثانیہ اس کے تمام تصورات کا بنیادی مادہ ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے انقلاب کو تبدیلیٔ حالات سے کہیں بڑھ کر تبدیلیٔ احوال کے حصول کے لیے متصور کیا ہے۔ اس کے نتیجے میں انہوں نے حالات اور احوال کی complimentary وحدت بلکہ organic identity کو جس طرح کم سے کم تصوراتی نہج سے واضح کیا ہے وہ مسلمانوں کے انقلابی لٹریچر اور تحریکی روایات میں ایک نئی چیز ہے۔ اس کا بالکل clinincal تجزیہ درکار ہے، مگر اس کی سطح ایسی ہونی چاہیے کہ بلند تر اذہان بھی اسے قبول کریں، گہری طبیعتیں بھی اسے منتہائے رغبت بنائیں اور مضبوط ارادے کے لیے بھی اس سے کوئی سمت حرکت نکالی جا سکے۔ ڈاکٹر صاحب کا ایک بڑا امتیاز ہی یہ ہے کہ اسلام اور مقاصدِ اسلام پر غور وفکر کرتے وقت وہ جن نتائج تک پہنچتے ہیں انہیں انسانی قابلیت کے تمام مراکز کے لیے موجب قبول اور باعثِ تسکین بنا دیتے ہیں۔ یہ مجموعی پن جو انسانی استعداد و حقائق میں اتحاد پیدا کرتا ہے، بہت غور کے ساتھ لائق تجزیہ ہے۔ ڈاکٹر صاحب کے انقلابی تصورات اور تجدیدی افکار اپنی ساخت میں یوٹوپین ہونے کے باوجود ہر پہلو سے قابل عمل لگتے ہیں، یہ ایک نادر چیز ہے اور اسے اچھی طرح کھولنا چاہیے۔ یہ بھی دیکھنا ہے کہ نشاۃِ ثانیہ اپنے معروف تصورات کے مطابق محض تجدیدیت نہیں ہے بلکہ تجدیدِ ایمان کا وہ عمل ہے جو انقلاب کے لیے درکار باطنی reconditioning کا سب سے پہلے تقاضا کرتا ہے۔

ڈاکٹر صاحب کی فکر پر باتیں تو بہت سی کی جا سکتی ہیں، لیکن اپنی کم بضاعتی کی وجہ سے میں آخر میں یہی کہوں گا کہ آئیڈیلز کو بروئے کار لانا انسان کے شعور و وجود کا وہ منتہا ہے جہاں ان دونوں میں فرق نہیں رہتا۔ ایمان و

عمل کے تلازم کے مبحث میں یہی اصول کارفرما ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے آئیڈیلز کو پوری طرح بیان کیا ہے اور پھر اسے عمل میں لانے کے لیے ایسی تدابیر بھی نکالی ہیں جو ہمارے معمول کے نظام العمل اور استعدادِ فعل کے لیے نامانوس نہیں ہیں۔ اس سلسلے میں ان کا یہ اصرار صحیح ہونے کے ساتھ ساتھ اتنا فطری ہے کہ قرآن ہی وہ کتاب ہے جو آئیڈیلز بھی فراہم کرتی ہے اور ان کی actualization کے لیے درکار قوت بھی یہیں سے ملتی ہے۔ بعض لوگ اس بات پر معترض ہیں کہ ڈاکٹر صاحب سیرت النبی ﷺ سے بڑے بڑے اصولِ اعتقاد و عمل اخذ کرتے ہیں۔ یہ اعتراض تعجب خیز ہے' کیونکہ سیرت کی اس مرکزیت کا انکشاف تو ڈاکٹر صاحب کا بہت بڑا کارنامہ ہے۔ وہ نہ ہوتے تو شاید ہمیں پتا نہ چلتا کہ رسول اللہ ﷺ تمام آئیڈیلز کے actualizer بن کر تشریف لائے تھے اور آپ ﷺ کے سوانح دراصل تاریخ پر انسان کی فتح کی روداد ہیں۔ اسی سے تو وجود کی انسانی ساخت کو تاریخ کی جدلیاتی ساخت پر غالب آنے کا راستہ ملتا ہے۔ نشاۃِ ثانیہ کا ہر تصور سیرت کی تجدید پر منتج ہوتا ہے۔ اور اگر ایسا نہیں ہے تو ہم قرآنی آئیڈیلز کے authentic mode of actualiztion سے محروم رہ جائیں گے۔ ڈاکٹر صاحب کے جس رویے پر تنقید کی جا رہی ہے وہ درحقیقت اسلام کی انقلابی فکر کو اس کی بنیاد فراہم کرنے کا عمل ہے۔

میں یہ نہیں کہتا کہ ڈاکٹر صاحب کی فکر پر نقد و جرح کی کوئی گنجائش نہیں' یقیناً ہے' لیکن ان کے ناقدین کی اکثریت حق کی اس انفسی حاکمیت اور آفاقی شکوہ کا کوئی تصور نہیں رکھتی جو ڈاکٹر صاحب کی شخصیت کا جوہر ہے اور ان کی فکر کا بنیادی مادہ۔ ڈاکٹر صاحب نے ممکن ہے کہ کچھ راستوں کے انتخاب میں یا کچھ تفصیلات کے تعین میں غلطی کی ہو لیکن ان کا مقصود بہرحال قرآن ہی ہے' دین ہی ہے۔ جب کہ ان کے بیشتر مہربانوں نے چاہے راستے بہت اچھی طرح تراش لیے ہوں مگر ان کی مطلوبہ منزل نہ پوری طرح قرآنی ہے نہ exhaustively دینی۔

